"خدا کے لئے انوری! مت روؤ۔ ۔ ۔ ایسے ہی ہوتا ہے ہمیشہ۔ ہر جگہ۔ ۔ ۔ ہر لمحے۔ ۔ ۔ یہ فیصلے ان کے ہاتھ میں ہیں جو تمہارا دل نہیں دیکھ سکتے۔ جنہیں تمہارا دل دکھایا نہیں جاسکتا۔ ۔ ۔ ۔ خدا کے لئے مت روؤ انوری۔ ۔ ۔ ہائے چپ کرجاؤ۔ پلیز انوری۔ ۔"

گاؤں کی لڑکی لاہور سے واپس جارہی تھی۔ اسے سنڈریلا کی طرح جو کانچ کی جوتیاں ملی تھیں وہ ایک مختصر وقت کے لئے تھیں۔ اس کے بعد وہی کدو۔ ۔ ۔ وہی چوہے جو لمحہ بھر پہلے اس کی گاڑی بنے اسے اڑائے پھر رہے تھے۔ واپس اپنی اصلی ہیئت میں لوٹ آئے تھے۔

انوری واپس جارہی تھی۔

واپڈا کی بجلی چھوڑ کر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تیل کے دیئے کے پاس۔

ٹیڈی قمیص اتار کر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پھلکاری پہنے۔

سرویٹ گلاسوں میں جمانے کے بعد۔ ۔ سرسوں ساگ اور مکئی کی روٹیاں اٹھائے چلی جارہی تھی، چلی جارہی تھی۔ ۔ ۔ اس کے نتھنوں میں نئی فصلوں کی خوشبو تھی۔ ۔ اس کی آنکھوں میں حدِ نظر تک ہریالی تھی۔ اور اس کے دل میں وہ اِکّا چل رہا تھا جو دلدل میں دور تک اپنے پہیوں کا نشان چھوڑتا جاتا ہے۔

"رمضان بازار گیا ہے اسے میرا سلام کہہ دینا، آپا!" انوری نے آہستہ سے کہا۔

یہ سلام اس مشعل کی طرح روشن تھا جو اولیمپک کی کھیلوں میں کھلاڑیوں کے ہاتھ میں جگمگاتا ہے۔ یہ تمہارا سلام میں رمضان تک کیسے پہنچا سکتی ہوں انوری! رشّو نے جی میں سوچا۔

"تم خود سب سے مل کر کیوں نہیں جاتیں انوری؟" رشّو نے پوچھا۔

"ابّا کو جلدی ہے بس نکل جائیگی ہماری۔"

"پھر بھی ابھی تنویر بھی کالج سے نہیں آئی۔"

"بیگم صاحبہ نے حساب کر دیا ہے۔ جی۔ ابّا تانگہ لے آیا ہے۔ میں تو۔۔ میں سلام کرنے آئی تھی آپ کو۔۔" وہ دروازے کی طرف بڑھنے لگی۔

"خط لکھوگی مجھے جبران سے؟"

"مجھے تو لکھنا نہیں آتا۔ آپا جی۔"

"کسی سے کہہ کر لکھوا دینا۔"

"اچھا جی۔۔۔"

"ڈیوڈ کو بھی سلام کہنا آپا جی۔ اور رمضان کو بھی۔ میرا کہا سنا معاف کر دیں سب۔ بہت تنگ کیا ہے میں نے سب کو۔"

رشّو اور وہ دونوں قدم قدم پر پڑاؤ ڈالتی دروازے کی طرف جا رہی تھیں۔

"تھوڑی دیر رک جاتیں۔ انوری! ڈیوڈ آ ہی رہا ہوگا تنویر کو لے کر۔"

"نہیں جی تانگہ آگیا ہے۔"

"اچھا سلام کہہ دینا میرا بھائی غلام رسول . . اور رمضان کو۔"

"غلام رسول بھی گھر پر نہیں ہے۔" رشو نے پوچھا۔

"اکبری منڈی گیا ہے جی۔ چاولوں کا پتہ کرنے . . ."

رشو نے لب کاٹ کر کہا۔

"اتنی جلدی کیوں تانگہ لے آیا تمہارا ابا۔"

"بس جی جلدی ہے اسے . . . بیگم صاحبہ نے حساب کر دیا ہے۔"

وہ دروازے کے پاس لمحہ کو ٹھٹکی پھر اس نے یکبارگی رشو کے گرد بانہیں ڈال دیں۔ اس کا سینہ سسکیوں سے یوں بھر گیا۔ جیسے پیراشوٹ ہوائی جہاز سے نکلتے ہی ہوا سے بھر جاتا ہے۔

سنڈریلا چلی گئی۔

لیکن اس شہر میں بڑے بڑوں کو توفیق نہ ہوئی کہ اس کی شیشے کی جوتی لے کر اس کی کھوج کو نکلتا۔ رمضان تو پھر بے چارہ بیس روپے ماہوار پہ ملازم تھا۔

. . . .

بھاولپور کی کال گیچی جب پہلی بار لاہور آئی تھی تو فتح شیر روڈ پر . . جہاں خالہ فیروزہ جنسی لطیفے سناتی تھیں۔ نذیر بلیڈیئر سے عشق کرتی تھی۔ ریاض روبوٹ بنانے سے لے کر کیفے ڈی گھانس پھونس میں مغلیہ لباس کے بہروں کو ڈبل شفٹ

میں کام کرنے کے پلان بناتا تھا۔ اور ان سب کا سردار خالو جمال انٹی کرپشن میں بڑے معتبر عہدے پر تھا۔ یوں سمجھیے کہ کسی نے ہانڈی کے منہ پر کپڑے کے چیتھڑے باندھ اردگرد مٹی کا لیپ کر کے اسے اپلوں کی آگ میں کشتہ بنانے کو ڈال دیا۔ ایک ایک کر کے ہر نظریے کو قلعی کرنا پڑی۔

دراصل عفتہ ایبڑ کی اور بات تھی۔ وہ سیلہ گھومنی تھی۔ اپنی ہاٹ لگا کر نہ بیٹھی تھی بلکہ پچھواڑے اِدھر اُدھر جھانکتی رہی۔ اب دن بدن ضمیر سست الوجود ہوتا جا رہا تھا۔ جیسے کوئی ریگمال سی چیز دل کی کھردری سطح کو موزیک فرش جیسا چکنا بنا رہی تھی۔ پہلے وہ لمبی سی چوٹی کرتی تھی۔ اب ڈھیلے ڈھالے بال لمبے کانوں کو چھپا کر جوڑے کی شکل میں بندھنے لگے۔ ہر روز کالج سے واپسی پر قمیص میں فٹنگ تبدیل ہونے لگی۔۔۔ نامعلوم سی لپ سٹک بھی کہیں سے آگئی۔ اور پلکوں کے سرے بھی برش سے اوپر کی طرف موڑے جانے لگے۔۔۔ یہ ساری تبدیلیاں ظاہری تھیں۔ ایک ایسی تبدیلی بھی تھی جو اندر ہی اندر سانپ کی کینچلی کی مانند اپنا وجود نئے سانچے میں ڈھال رہی تھی۔ اس تبدیلی کا خود رشیدہ کو بھی علم نہ تھا۔ اسے تو پتہ بھی نہ چلا کہ کب وہ کالج کی لڑکیوں کے ساتھ بازار جانے لگی۔ کس دن اس نے انٹر کالج مباحثوں میں شرکت کرنے کا فیصلہ کیا۔ اور کب سے وہ اپنے دوستوں کے ساتھ میٹنی شو دیکھنے لگی۔ بالکل جس طرح چولہے پر چڑھنے والی کیتلی کے اندر ذرات کی تہ کھپڑ کی طرح جم جاتی ہے اسی طرح آہستہ آہستہ رشیدہ کی انا نے اپنے گرد جوازوں، تاویلوں، اور منطقوں کی فصیل

تعمیر کرلی تھی۔

گھر سے پہلا قدم اٹھانا مشکل ہوتا ہے۔ ایک بار جب مہارانی سیتنا باؤنڈری لائن الانگ گئیں۔ تو مشکل ویپ تک کا سفر پلک جھپکتے میں ختم ہو گیا۔

جب وہ نیو لائٹ سٹور میں داخل ہوئی تو ڈیبل اس کے ساتھ تھی۔ وہ دونوں پرس جھلاتی پروفیسر اعجاز کے لیکچر پر تبصرہ کرتی سیڑھیاں چڑھ گئیں۔

"جو مثال پروفیسر اعجاز آج دے رہے تھے وہ غلط تھی۔" ڈیبل ہولے سے بولی۔ "وہ تو ہمیں احمق سمجھتے ہیں۔ جو جی چاہتا ہے بولتے جاتے ہیں۔"

"مثال تو ٹھیک تھی لیکن انہیں ایکسپلین کرنا نہیں آیا۔" رشو نے ازراہ مروت کہا۔۔۔

"شی زو فرینیا اور Dementia Precox کے تو بڑے ہی ماہر ہیں۔ ہر آدمی انہیں ان بیماریوں میں مبتلا نظر آتا ہے۔ سارے لاہور شہر میں ان کے نزدیک ایک بھی نارمل آدمی نارمل زندگی بسر کرتا نظر نہیں آتا۔ پھر مثال کیوں غلط دی انہوں نے"

رشو کی نظروں میں پروفیسر اعجاز گھوم گئے۔۔۔۔ لانبا قد، مدھم گندمی رنگ جو ناک اور دہن کے ارد گرد ذرا سنولایا ہوا تھا۔ اور گالوں اور ماتھے پر کھلتا نظر آتا تھا۔۔۔ کنپٹی پر سفید بال۔ باتوں میں ایک قسم کی رکاوٹ جو رشو کے نزدیک سقراطی ذہانت کی دلیل تھی۔

آباجی بھی اسی طرح رک رک کر بولتے تھے۔۔۔ آباجی کے کانوں کے اوپر بھی

چاولوں کا چھینٹا بالوں پر پڑ گیا تھا۔

"استری نہیں آٹو میٹک چاہیئے ناں . . ." ڈمپل نے سوال کیا۔

"ہاں . . . آں !"

وہ دونوں شیشے کی اس الماری پر جھک گئیں جو ان کی ناف تک اونچی تھی اور جس میں کافی پرکولیٹر، ٹوسٹر، ہیٹر، الیکٹرک روڈز، استریاں، بلینڈر، مکسر، ہوٹ پلیٹ، ربڑ کے چھوٹے پنکھے، مسالہ پیسنے والی چھوٹی چوکور مشینیں اور بجلی کا ان گنت سامان پڑا تھا۔ انہیں دیکھ کر اظہر اس طرف سے چلا آیا جہاں وہ ایک امریکن کو فرج دکھا رہا تھا۔

"جی فرمائیے۔"

"بجلی کی استری چاہیئے جی ہمیں . . ." رشو نے اظہر کی طرف لمحہ بھر کو دیکھا اور پھر نظریں جھکا لیں۔

یہ چہرہ جانا پہچانا تھا۔ گو یہ آدمی موٹا تھا پر . . . میں نے اسے پہلے کہاں دیکھا ہے؟ . . . کہاں؟ کہاں . . . کہاں؟"

"استری آٹو میٹک ہو . . ."

"جی میں سمجھ گیا۔ پانی چھڑکنے والی چاہیئے کہ سادہ؟" کوڑیاں تار والی استری نکالتے ہوئے اظہر نے پوچھا۔

"کیوں رشو؟"

"پالی بے شک نہ پھرے کے ہی۔ بیکن رنگولیٹر لگا ہڈ کاشن، ربیاں، نائیلون وغیرہ کے لیے۔"

"بہت خوب! زحمت نہ ہو تو ادھر آجائیے ذرا۔"

وہ اظہر کے پیچھے اس طرف چلی گئیں جہاں کاؤنٹر نما تختے پر تولیے کے بنے ہوئے پلنگ پوشس پڑے تھے۔ اظہر اپنی دوکان میں سیلز مین نہیں تھا پھر بھی اس نے خود دو چار بدیسی استریاں نکال کر کاؤنٹر پر رکھ دیں۔

"یہ آٹو میٹک ہے اور سستی بھی ہے۔ پانچ سال کی گارنٹی ہے اس کی۔"

"گارنٹی تو خیر کسی بات کی بھی نہیں لی جا سکتی۔"

رشو کو کب معلوم تھا کہ مال روڈ کی اس دوکان میں اس وقت اندر والا دروازہ کھول کر ظفر آجائے گا؟ ظفر کی شکل دیکھتے ہی لوٹتی ہوئی نظر نے اظہر کو پہچان لیا۔ دونوں میں اس چھپی ہوئی مشابہت کو بھانپ کر رشو کو بڑی عجیب سی خوشی ہوتی۔

ظفر کالج سے لوٹتے ہوئے پتہ نہیں کیوں دوکان پر آگیا تھا۔ ایک بے چینی سے سارے لاہور میں اڑائے پھرتی تھی۔ اتنے سارے خط جو اس نے رشو کو لکھے ان کے جواب میں اسے ایک ہی چیز نصیب ہوئی . . . بے چینی . . .

کبھی وہ تین منزلہ مکان کی چھت سے کود جانے کا پروگرام بناتا کبھی خواب آور گولیاں کھا کر سو رہنے کی تمنا کرتا . . . یہ عشق نہیں تھا بلکہ اسے یوں احساس ہوتا

تھا جیسے اس کے گلینڈز بگڑ گئے ہیں۔ تھائرائڈ اور ایڈرنل نے کام کرنا چھوڑ دیا ہے۔ پچیوٹری اپنا فنکشن کرنا بھول گئی ہے۔ سائیکلوجی کے ایم اے میں پڑھنے کی رعنائیت سے وہ یہ ماننے کو تیار نہ تھا کہ وہ رشو کے عشق میں مبتلا ہو گیا ہے۔ یہ گھٹیا بات تھی۔ ... بالکل معمولی، افسانوی فلمی۔ ایم اے میں پڑھنے والے انٹلیکچول قسم کے لڑکوں کو عشق وشق سے کوئی تعلق نہ تھا۔ اسی لئے تو اس کے سارے خط نفسیات۔ کے نوٹس کی مانند دقیق، گنجلک اور سائیکلوجی کی ٹرمز سے بھرے ہوئے تھے۔

"وہ اظہر سے پھر رکھیں گے جی کسی روز ایک اچھی سی افطار پارٹی۔۔۔ آپ کے پروفیسر صاحب کو بھی بلائیں گے جی۔۔ کیا نام ہے ان کا۔۔۔ اعجاز حسین کو بھی ہر ہائے جی اسی خوشی میں ایک آئس کریم پارٹی۔۔۔ ضرور رکھیں گے جی کسی دن۔ آپ دوکان پر آئیں جی کسی دن۔۔۔ وہاں رکھیں گے جی۔۔" اسی "رکھیں گے" کے سلسلے میں دوکان پہ پہنچا تھا۔ اور پون گھنٹے سے اندر گودام میں کھڑا سامان دیکھے جا رہا تھا۔ اور اظہر ایک کام سے دوسرے کام تک ٹڈے کی طرح پھدک رہا تھا۔ اب جو اندرونی بے چینی نے ظفر کو باہر نکالا تو رشیدہ میز کاؤنٹر پہ کہنی ٹکائے کھڑی تھی۔

وہ میری نگاہ سے اس طرح کانپتی ہے جیسے صحرا کی اونٹنی تنگ پینے وقت لرزتی ہے۔ جب میں اپنی نظروں کے تیر سے اسے چھوتا ہوں تو وہ اس طرح سمٹ جاتی ہے جیسے گوری عورت بازوبند کی ٹھنڈک سے۔ اس [illegible] وہ پانی ہے جو دور دراز کے سفر پر میری گردن سے اکیلا لپٹا ہے۔ اس کی محبت میں میں جنگل جنگل پھرتا

ہوں۔ گویا میں اور ہریالی باہم نسبت ہی کر آپس داری کرتے ہیں۔ اسی رعایت سے وہ بھی میری رشتہ دار ہے۔ کیونکہ جاسم کے سرلوں نے اسے اپنی آنکھیں دے دی ہیں آنکھوں میں ادر گدرسی بھری رہتی ہے نیند تو آتی ہے مگر وہ سوتی نہیں۔

ظفر نے لمحہ بھر کچھ سوچکر سر جھٹکا۔ اپنے خیالات کو Alterations کا خطاب دے آگے بڑھا۔ اور ڈمپل کے پاس آکر رک گیا۔ اس سے آگے بڑھنے کی اس میں ہمت نہ تھی۔

"گڈ ایوننگ مس۔

"گڈ ایوننگ۔۔" ڈمپل نے خوش خلقی سے جواب دیا۔

رشو نے سر کے نباتی جھٹکے سے سلام کا جواب دیا اور استری کے پلنگ کی پٹنگی دیکھنے لگی۔

"بھائی جان! یہ میری کلاس فیلوز ہیں۔ ڈمپل۔۔۔ اور۔۔۔ اور۔۔۔۔ رشیدہ میر مس۔"

"میرا نام شکیلہ ہے ظفر۔۔" ڈمپل نے مسکرا کر کہا۔

"یہ میرے بھائیجان ہیں۔۔ اظہر صاحب۔۔"

رسمی تعارف کے جملہ کوائف پورے ہو گئے۔ تو ایک بار پھر استری کی پسند پر چھان بین ہونے لگی۔

"پیلی بتی کی جگہ اگر سبز بتی ہوتی تو زیادہ attractive لگتی استری ہے نا رشو؟"

"خیر سر بھی کچھ ایسی بری نہیں"

اظہر انہیں استریوں کے پاس چھوڑ کر جا چکا تھا۔ لیکن چند لمحے بعد چائے ضرور آ گئی تھی۔ رشنو تو استری لیکر کبھی کی بھاگ گئی ہوتی لیکن ظفر چائے بنانے میں کچھ اس طرح مشغول تھا جیسے دودھ کی نہر کاٹ رہا ہو۔ کچھ کہنے کی ہمت نہ ہوئی۔

چائے کی پیالیاں دونوں لڑکیوں کو پکڑا کر ظفر بھائی جان کی طرف چلا۔ وہ کیشیئر کے پاس کھڑے ایک صاحب کو ایئر کنڈیشنر دکھا رہے تھے۔

"بھائی جان! کچھ رعایت کر دیجیے گا۔"

"بالکل بالکل تم فکر نہ کرو۔ چائے پہنچ گئی؟"

"جی ہاں۔ پہنچ گئی۔۔ شکریہ۔۔"

"تو پھر جی وہ رکھیں گے کسی دن تمہارے پروفیسر صاحب کے ساتھ۔ ان دونوں کو بھی بلا لینا۔ ہونی چاہیے ایک محفل کہیں جہانگیر کے مقبرے وغیرہ پر۔ سن سیٹ کے قریب۔۔"

ظفر ہاں جی ہاں جی کہتا ہوا لڑکیوں کی طرف لوٹنے لگا۔ اگر اس وقت اس کی جیب میں اتنے پیسے ہوتے اور رشنو کے انکار کا دھڑکا نہ ہوتا تو وہ ضرور استری کے دام خود ادا کرتا۔

عام بازاری بھاؤ سے تین روپے ساٹھ پیسے زائد ادا کرنے کے بعد جب ڈمپل رشنو اور ظفر سیڑھیاں اتر رہے تھے تو ظفر کے ابا جی سے ملاقات ہو گئی۔

ظفر کے باپ کی پرسنیلٹی کسی امریکن سیاست دان کی سی تھی۔ دراز قد لمبا سا وجود کھڑا کھڑا سوٹ جیسے کسی ملٹری شاپ کے درزی سے سلوایا گیا تھا۔ دو رنگے سابر اور پیٹنٹ لیدر کے بوٹ، منہ میں پائپ۔ وہ معمر فلمی ایکٹروں کی طرح بڑی علیحدہ سی زندگی بسر کرتے تھے۔ سمندر میں رہ کر جہاز جیسی علیحدہ زندگی۔

ظفر کے پیروں سے سیڑھیاں پھسل کر آگے فٹ پاتھ پر جا گریں۔

"سلام علیکم۔ اباجی۔۔۔"

"وعلیکم السلام۔"

لڑکیوں کے ساتھ ظفر کو اترتا دیکھ کر پہلی بار اباجی کو احساس ہوا کہ ظفر جوان ہو چکا ہے۔

"یہ۔۔۔۔ یہ اباجی میری کلاس فیلو ہیں مس ڈمپل اور رشیدہ ہیں۔۔۔ یہ میرے اباجی ہیں۔"

تعارف کے بعد مؤدب سلاموں کا سلسلہ شروع ہوا۔ رشو کے ہاتھوں میں نہ جانے کیوں ہلکا ہلکا پسینہ آنے لگا۔

اف توبہ! کیا پرسنلٹی ہے۔۔۔۔ کیا شاہِ بلوط جیسا قد ہے۔ باپ کے سامنے تو بیٹا بالکل ہی مخمل میں ٹاٹ کا پیوند۔۔۔

"کچھ خریدا ہے آپ نے اظہر کی دوکان سے؟"

"جی اباجی! میں یہاں اظہر بھائی سے ملنے آیا تھا۔ یہ اتفاقاً استری خریدنے

آ گئیں۔۔۔۔ استری خرید کر جا رہی تھیں۔ آٹو میٹک استری ہے۔ ریگولیٹر بھی لگا ہے نائیلون وغیرہ استری کرنے کے لیے۔" وہ کبھی ایک پیر پر کبھی دوسرے پیر پر کھڑا انجانے کیا کیا بکے جا رہا تھا۔

"بل کہاں ہے آپ کا؟"

رشّو نے بیاسی روپے نزانوے پیسے کا بل آباجی کے ہاتھ میں تھما دیا۔

"پہلی مرتبہ آپ آئی ہیں دکان پر؟"

"جی۔"

چند لمحے جیبوں کو ٹٹولنے کے بعد آباجی نے جیب سے بیاسی روپے نکالے اور انہیں رشّو کی طرف بڑھا کر بولے۔

"لو بٹیا۔"

"جی؟"

ظفر نے یکدم ریلنگ پکڑ کر اپنے آپ کو مستحکم کیا۔

"آپ ظفر کے ساتھ پڑھتی ہیں۔ ہم آپ سے کیسے پیسے لے سکتے ہیں۔ افسوس نزانوے پیسے میرے پاس نہیں ہیں۔ ورنہ وہ بھی میں تمہیں ضرور دیتا۔"

"لیکن جی۔۔۔ جی یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ یہ تو بڑی رقم ہے جی۔"

"بڑوں سے اس طرح بحث نہیں کیا کرتے۔ میں ظفر کا باپ ہوں۔ ظفر تمہاری کلاس میں پڑھتا ہے۔"

ڈمپل نے رشو کو نامعلوم سی کہنی ماری۔

"لیکن جی . . . یہ ضرورت کی چیز ہے۔ میں . . مجھے اس کے پیسے امی نے بھجوائے ہیں جی خاص . . . میں یہ . . ."

"دوبارہ آؤ گی اس دوکان پر تو جو کچھ خریدو گی اس کے پیسے خود ادا کرنا۔ پہلی بار اس طرح نہیں کرتے۔ یہ ہمارا رواج ہے۔ بچیوں کا حق ہوتا ہے اپنی دوکان پر۔"

رشو نے چپ چاپ پیسے پکڑ لئے۔

ظفر کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ گیس غبارہ ہے اور آپ ہی آپ اوپر کی طرف چڑھتا جا رہا ہے۔ صرف ملک صاحب نے کنکھیوں سے رشو کی طرف دیکھا اور بغیر کچھ سوچے بوجھے دوکان کی طرف چل دیئے۔

ان کے پاس لڑکیوں کے متعلق سوچنے کو وقت نہ تھا۔ وہ بڑے پیمانے پر سوڈا ایش کی فیکٹری بنانے کے پلان بنا رہے تھے۔ اور ان کی آئس فیکٹری میں ان دنوں جو لیبر کی ہڑتال ہو گئی تھی۔ اس کے سبب وہ سارا دن دماغی الجھنوں میں مبتلا رہتے تھے۔ نہ انہیں برٹرنڈ رسل پڑھنے کا موقع ملتا تھا نہ جولین ہکسلے پر تنقید کرنے کی فرصت ملتی تھی۔ جیمز جوائس، ٹی ایس ایلیٹ کا مطالعہ بند۔ ڈیوما اور کافکا کی ورق گردانی ختم۔ زندگی چرخے کی مال بنی بے مصرف گھومے جا رہی تھی۔

ظفر نے لمحہ بھر اپنے والد کی طرف دیکھا اور پھر رشو اور ڈمپل کے ساتھ ساتھ چلنے لگا . . .

"آپ کل شام الحمرا میں آئی تھیں شاید..."

"جی؟" رشو جان نے آہستہ سے پوچھا۔

"جی اور غالباً عنبری قطار میں بیٹھی تھیں۔"

"نہیں تو۔" رشو نے جھوٹ بولا۔

"پھر آپ کی ہمزاد تھی یا توام بہن تھی آپ کی۔"

"کیا ڈرامہ تھا؟" ڈمپل نے سوال کیا۔

"اڈاپٹیشن تھی... ڈرامہ نہیں تھا۔"

"خدا جانے یہ ادیب لوگ ڈرامے کیوں نہیں لکھتے۔ بس ہر وقت اڈاپٹیشنز... توبہ... توبہ... توبہ..." ڈمپل ہاتھوں پر لیس کے دستانے چڑھاتی ہوئی بولی۔

"دیکھئے ایک کپ کافی میرے ساتھ پئیں تو نوازش ہوگی۔"

رشو کا دل آبشار کے پانیوں کی طرح بیقرار ہو گیا۔

"خدا کے لئے انکار نہ کیجئے۔ یہ دیکھئے سامنے ہارس شو میں بڑا ہی ڈیسنٹ ہوٹل ہے۔ تھوڑی دیر گپ رہے گی۔ سائیکولوجی پر تبادلۂ خیال کریں گے۔"

"اگر وہاں بھی لیبیڈو اور مورٹیڈو کی باتیں کرنا ہیں آپ کو تو جناب میں تو چلتی ہوں میں ایسی تفریح سے ڈرائی کلینرز کی دکان میں کھڑا ہونا پسند کرتی ہوں۔"

"بھئی مجھے دیر ہو رہی ہے۔ ڈمپل۔"

"خدا کے لئے مس میرا!"

ظفر کی آنکھوں میں التجا تھی اور الفاظ اس کے لبوں پر سے اس طرح گذر رہے تھے جیسے چھوٹا سا بچہ دوست کے کھلونے کو چھو کر کہتا ہے . . "یہ تیرا ہے سارے کا سارا . ."

دکن میں مہیلا روپیہ شہر کے پاس ہی سنیاسیوں کا مٹھ تھا اور اس مٹھ کے پاس ہی ایک پوکھر تھا کہ جس پر گھن دار کائی جمی تھی - اور کنول کے سفید سفید پھول ہر رت میں کھلے رہتے تھے - اس تالاب کے کنارے ایک برگد کا ایسا گھنیرا درخت بھی تھا کہ دن کے وقت کرنوں کا گذر بھی ادھر نہ ہوتا تھا - اس درخت پر رکتو نامی ایک بندر رہتا تھا جب گھنی چھاؤں سے نکلتا تو رس بھری جامنوں کے درخت پر چڑھ جاتا - ادھر سے طبیعت بھر جاتی تو آم کی ڈالیوں سے جھولنے لگتا

ایک دن وہ بیٹھا تن سے جوئیں نکال رہا تھا کہ ایک کچھوا رجنا نامی تالاب سے نکلا اور ساحل پر آ کر لمبی لمبی جمائیاں لینے لگا - بندر کو کچھوے کی یہ بات بہت پسند آئی اور ہاتھ دوستی کا بڑھایا - پکے پکے جامن کھلائے، رس بھرے آم توڑ کر لایا - اب کچھوا ٹھا آبی جانور، گدلے پانیوں میں رہنے والا، جامن اور آم جو منہ میں گئے تو پرسن ہو گیا - گھر گیا اور پتنی کے لئے بھی تھوڑی سی سوغات دونے میں لیتا گیا - پتنی نے جو آم اور جامن کھائے تو بولی سی بولی . . "ہائے رے رجنا پر تو ان میں تو گٹھلیاں ہیں!" رجنا بولا . . "اور جو گٹھلیاں نہ ہوتیں تو اور پودے کہاں سے لگیں؟" استری چھوٹے بچوں سے بولی . . "دیکھو بیٹا! جو پہلی بھینٹ میں ایسی مزیدار دکھا دے وہ

مرتا نہیں ہوتا۔

دو چار دن پھر کچھوا بندر سے ملنے گیا۔ خوب خوب آم جامنیں کھائیں اور بیوی کے لئے بھی دونا بھر کر لے گیا۔ تھوڑے ہی دنوں میں بندر اور کچھوا ہرے اوپر اور نیچلے جبڑے کی طرح ملنے لگے۔ اور ایک گھڑی کو بھی جو ایک دوسرے کو چھوڑتے تو پھڑک اٹھتے۔ رجنا کی دھرم پتنی کو یہ بات بہت بری لگی۔ ایک روز جب کچھوا جامنوں کا دونا لے کر آیا تو اس کرم جلی نے منہ میں دو جامنیں ڈال کر ادھ چبی، وہ پیچھے رونا شروع کر دیا مر گئی۔ دہائی ہے! کوئی بے جنم جلی کو بچائے۔ ۔ ۔ ۔ ہائے بھگوان کس جنم کا پاپ سامنے آیا۔" کچھ دیر تو کچھوا اس کا منہ دیکھتا رہا پھر گھبرا کر پوچھا "کیوں بھاگوان کیا ہوا؟" "ہونا کیا ہے مر گئی۔ تیرے اس مرن جوگے نے اپنا وار کیا۔ مجھے سمایت کیا اب تو ہوگا اور دے۔ مر تو میں گئی۔ کیونکہ میں جھاڑو تو میری ماں کے پچھری" بڑی منت سماجت کے بعد پتہ چلا کہ حلق میں جامن کی گٹھلی پھنس گئی ہے۔ "میں تو سدا کی کہتی تھی کہ وہ گٹھلی وار چھلیا اسی کارن بھیجتا ہے ورنہ کہاں ہماری جاتی کہاں بن مانس۔ ۔ ۔ ان کی گانٹھ تو ہنومان جی سے ملتی ہے۔ وہ ہم سے کب ملتے ہیں بن گھوٹے کے۔"

تھوڑی دیر تک گھر والی اوٹ پٹانگ لیے پڑی روتی رہی تو کچھوے کا من پانی کی طرح پگھل کر ٹھنڈا ہو گیا۔ جب رجنا کو یوں موم ہوتے دیکھا تو دھرم پتنی ایڑیاں رگڑنے لگی۔ اور بولی۔ ۔ "اگر اس شودر کا ہردے مجھے لاکر نہ دیا تو میں تیرے گھر نہ بسوں گی۔ لے اپنے دودار کی راکھی کر۔ ۔ ۔ میں تو چلی نیچے مجھ کرم جلی

کورویئں گے . . . روئے دے کلپنے دے ۔ مر گئی تو میری چتا پر نہ آئیو ۔ میرے کیاں کریا
پر نہ پہنچیو۔"

بیوی کی باتیں سن کر رجنا کے پیروں تلے سے دھرتی نکل گئی ۔ چیخ کر دلاسہ
دیا اور بندر کا دل نکالنے کے لئے پکڑ کے باہر چلا ۔

رشوؔ جان میز پر کہنی ٹکائے بیٹھی تھی ۔ ڈمپل در موپ کانٹے کے ساتھ
چار خانہ والا سموسہ کھانے میں مشغول تھی ۔ اور ظفر سوچ رہا تھا ۔ کاش رشو مجھ سے کہے "جا
اپنے باپ کا کلیجہ نکال کر سٹین لس سٹیل کے طشت میں دھر کر لے آ ۔ کاش یہ کہے کہ دیکھ میں سوگ…
ہوں اور جب تک تیرے باپ کا کلیجہ لہو اور انگوری شراب میں ڈوبا ہوا میرے سامنے نہ
آئے گا میں تجھ سے کبھی نہ بولوں گی "۔

اسی مکروہ خیال سے اس نے گردن جھٹک کر چھٹکارا تو پا لیا ۔ پر ضمیر کا تیر دل میں سید…
کھڑا ہو گیا ۔

ظفر کی طبیعت میں بلا کی شدت تھی ۔ اسے جب رشو جان سے محبت ہوئی تو اس…
میں میدانی علاقوں کے دریا کی سست رفتاری نہ تھی بلکہ قطب شمالی کے برف پر چلنے وال…
برق رفتار برف گاڑیوں کی سی تیزی تھی ۔ وہ رشو جان کے لئے کچھ کرنا چاہتا تھا ۔ مہیب…
. . . خطرناک . . . اچھوتا . . . ان ہونا . . .

وہ کسی طرح رشو جان پر یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ نسل انسانی میں وحشت و رفا کی تمام
رموز صرف اسی کو سمجھ آتے ہیں ۔ صرف وہی محبت کے پانیوں کا پیراک ہے ۔

"اب چلیں ناں ڈمپل۔ بڑی دیر ہو گئی ہے سچ!" رشّو نے کہا۔

"ابھی سے ۔ ۔ ۔ ابھی سے؟" ظفر نے سوال کیا۔

"بڑی دیر ہو گئی ہے سچ۔"

میز پر فارمیکا کی آئینہ سی سطح میں رشّو کا چہرہ منعکس تھا۔ ظفر اسی عکس پر نظریں جمائے بیٹھا سوچ رہا تھا۔

"یہ لڑکی کون ہے؟ اور مجھے کیوں عزیز ہے؟ یہ کہاں سے آئی ہے؟ اور کیوں آئی ہے؟ اگر اس وقت میں اس کا حلق اپنے ہاتھوں سے گھونٹ دوں تو کیا ہے؟"

ہر بات اس کے حلق میں بگولے کی طرح اٹھتی اور بیٹھ جاتی۔ ساحل کی ریت کی مانند ۔ ۔ ۔

میں نے اپنے ابا جی کے متعلق ایسی بھیانک بات کیوں سوچی بھلا؟

میرے جی میں یہ خیال کیوں ابھرا؟

یہ لمبے کانوں والی جادوگرنی کیسی ہے جو دریا کے پانی کو ایک ہی لاٹھی مار کر دو حصوں میں منقسم کر دیتی ہے؟ پھر ان پانیوں میں خشک راستہ اتنا بڑا ہو جاتا ہے کہ اس پر بنی اسرائیل کے گدھے زیتون کے تیل سے بھرے مشکیزے اٹھائے اور عورتیں کندھوں پر جَو کی روٹیاں لٹکائے اور مرد لاٹھیوں سے جانوروں کو ہانکتے، کندھوں پر یہودی بچوں کو اٹھائے چلے جا رہے تھے ۔ ۔ ۔ ۔ یہ پھٹے دریا کے درمیان کیسا قافلہ رہا تھا ۔ ۔ ۔ یہ لوگ کون تھے؟ کدھر جا رہے تھے؟

ظفر پر ان گوناگوں غیر مربوط خیالات کی یورش ہو رہی تھی ۔ اور وہ خود حیران تھا کہ یہ باتیں اس کے ذہن کے کس گوشے میں چھپی ہوئی تھیں کہ ذرا سا پتھر اٹھتے ہی ذہن کی کالی غار ان گنت تتلیوں سے منور ہو گئی ۔

جب ڈمپل تھوڑی دیر کے لیے ٹائلٹ میں گئی تو ظفر نے آہستہ سے پوچھا ۔

"آپ کو میرے خط مل گئے تھے ؟"

رشو نے گھبرا کر اِدھر اُدھر کنکھیوں سے نظریں دوڑائیں لیکن ہر طرف باوردی بیرے پھر رہے تھے ۔ میزوں پر نگاہ ڈالی تو رشو کا کلیجہ دھک سے رہ گیا ۔

چار میز چھوڑ کر ادھر سرخ ٹائی اور چہرے پر سیاہ چشمے لگائے ریاض بیٹھا تھا ۔

"آپ میرے خطوں کا جواب کیوں نہیں دیتیں !"

"پلیز ! خاموش رہیں ۔"

"میں ریت کی گھڑی نہیں ہوں مس رشیدہ ! کہ ذروں کی پتلی دھار بن کر وقت میں ڈھلتا رہوں ۔ ۔ میں ۔ ۔ ۔ میں ۔ ۔ ۔ تو وہ زمستانی ہواؤں جو ہڈیوں کے آرپار ہو جاتی ہے ۔ جو دروازے کھڑکیوں کی درزوں میں سے نکل کر لحافوں کو چیر جاتی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ میں بہت ضدی ہوں ۔ ۔ ۔ بے حد ۔ ۔ ۔ آپ نے اگر میرے اس خط کا جواب نہ دیا تو ۔ ۔ ۔ تو میں کچھ شرمناک حرکت کر بیٹھوں گا ۔"

یہ کہہ کر اس نے جیب سے ایک نیلا لفافہ نکالا ۔ اور رشو کی پیالی کے پاس رکھ دیا ۔ ۔ ۔

"آپ کو مجھ سے بالآخر محبت کرنا ہوگی ۔ کرنا ہوگی اور ضرور کرنا ہوگی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں پہلے گڑگڑاؤں گا پھر جھنجھوڑدوں گا اور بالآخر تمہیں زبردستی اغوا کرونگا ۔"

سیاہ چشمے والے ریاض نے چہرے سے عینک اتار کر رشو کی جانب دیکھا ۔

ابھی کچھ دیر پہلے وہ ظفر کے لئے بڑی انجانی سی کشش محسوس کررہی تھی ۔ اور اب وہ سب کچھ ختم ہو رہا تھا ۔ جیسے اس پر بیک وقت دو لیباروں سے حملہ ہوا ہو ۔ ادھر ظفر کی آنکھیں وحشتناک لہجہ اختیار کرگئیں ۔ ادھر ریاض برے جیسی نگاہوں سے اسے گھورنے لگا ۔

"میں اس خط کا انتظار کروں گا جو تمہیں اب تک مجھے لکھ دینا چاہیئے تھا ۔"

رشو نے ڈمپل کو دیکھ کر مارے گھبراہٹ کے نیلا خط اٹھایا اور اسے جلدی سے پرس میں ڈال لیا ۔

"اب ہمیں اجازت دو ظفر ! ۔ ۔ ۔ مجھے واقعی دیر ہو رہی ہے ۔"

"پھر ؟"

"پھر کیا ؟"

"تمہاری خاطر ہم نے اپنا اصول توڑ لیا ۔ ہم کسی کالج کے لڑکے کے ساتھ آج تک کسی ریسٹورنٹ میں نہیں گئیں ۔"

"میں کالج کا لڑکا نہیں ہوں ۔ ۔" وہ منہ تھتھا کر بولا ۔

"پھر کیا ہو تم ؟"

"کورج کا اسٹنٹ منیجر ۔"